© rasailojaraid.com

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

تقسیم کے بعد

(۱۲)

از سعید احمد اکبر آبادی

البتہ ڈاکٹر صاحب میں ایک بڑی کمزوری یہ تھی کہ جس کے وہ دوست ہوتے اور جس پر ان کی نظرِ لطف وکرم ہوتی اسے وہ خوب نوازتے تھے اور یہ امداد کا جذبہ ان میں اتنا شدید تھا کہ اگر اس شخص سے ذاتی طور پر ان کو کبھی تکلیف پہونچی ہے تو وہ اسے بھی نظرانداز کر دیتے تھے، ظاہر ہے دوست نوازی کا یہ جذبہ ذاتی اور شخصی معاملات میں نہایت محمود اور عالی حوصلگی و بلند نگاہی کی دلیل ہے لیکن جب اس کا ظہور قومی اور ملی امور میں ہو تو اس کی نوعیت بدل جاتی ہے اور اس سے قومی و ملی مفاد کا نقصان ہوتا ہے۔

کرنل بشیر حسین زیدی

ڈاکٹر صاحب کی سبکدوشی کے بعد کرنل بشیر حسین زیدی (اکتوبر ۱۹۵۶ء میں) وائس چانسلر مقرر ہوئے، موصوف جانسٹھ ضلع مظفر نگر کے خاندان سادات سے تعلق رکھتے ہیں، نہایت شریف، بامروت اور وضعدار انسان ہیں۔ آکسفورڈ یونیورسٹی کے گریجویٹ ہیں۔ علی گڑھ میں یونیورسٹی ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر اور اس کے بعد ریاست رامپور میں وزیر اعظم رہے ہیں۔ ریاست کے آخری دور میں انتظامی، تعلیمی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور معاشی اصلاحات اور ترقیاں جو کچھ بھی ہوئیں وہ موصوف کے ہی حسنِ تدبر اور حسنِ انتظام کا نتیجہ تھیں، پھر عادات وخصائل اور طور طریق زندگی کے اعتبار سے بھی ان کی مشرقیت صاف ظاہر اور نمایاں تھی، اگرچہ ان کا شش سالہ عہدِ وائس چانسلری بیرونی اور اندرونی خلفشار کے اعتبار سے یونیورسٹی کا ایک پر آشوب اور صبر آزما دور تھا، لیکن وہ جس خوبی اور عمدگی کے ساتھ اپنی کشتی اس منجدھار میں سے صحیح سلامت نکال کر لے گئے وہ ان کی بیدار مغزی، اخلاص اور عزم وہمت کی دلیل ہے۔

ایک معذرت

قبل اس کے کہ آپ یہ داستان سنیں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ راقم الحروف کا علی گڑھ سے تعلق زیدی صاحب کے عہد میں ہی ہوا تھا اس بنا پر اب یہاں سے لے کر آخر تک جو کچھ لکھا جائے گا وہ راقم الحروف کے ذاتی مشاہدات وتجربات اور احساسات وتاثرات کے ماتحت اور ان کی روشنی میں ہوگا۔ اس لئے دو باتوں کی معذرت کر دینا ضروری ہے، ایک اس بات کی کہ آیندہ میں صیغۂ واحد متکلم استعمال کروں گا اور ایسے موقع پر ممکن ہے بعض جملوں اور فقروں سے خودستائی کا پہلو پیدا ہو تو قارئین مجھے معاف فرمائیں اور یقین رکھیں کہ ان کا مقصد اپنی بالاخوانی ہرگز نہیں ہے، بلکہ محض بیان واقعات ہے جس کی تصدیق علی گڑھ کا ہر واقف حال کر سکتا ہے، واللہ علی ما اقول شہید، اور دوسرے یہ کہ ممکن ہے میرے بعض فقروں سے کسی کو کوئی ناگواری ہو تو ان کو بھی باور کرنا چاہیے کہ ان کا مقصد ہرگز شخصی طور کسی کی آزردہ دلی نہیں ہے، برہان کا پورا فائل اس کا گواہ ہے کہ میرا قلم ہمیشہ اس سے بڑی سختی کے ساتھ مجتنب اور محترز رہا ہے، بلکہ اس کا مقصد بھی اظہار واقعات ہی ہے جس کو موجودہ حالات میں یونیورسٹی کی اصل حیثیت اور پوزیشن واضح کرنے کے لئے اپنا فرض سمجھتا ہوں۔

علی گڑھ میں میرے بلانے کی تحریک

بھائی مولانا حفظ الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ شروع سے مجھ کو علی گڑھ لانے کے خواہاں اور اس کی فکر میں تھے، چنانچہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میمن عبدالعزیز صاحب کے سبکدوش ہونے کے بعد جب وہاں عربی کے پروفیسر کی جگہ خالی ہوئی تو انھوں نے مجکو اس کے بارہ میں لکھا، میں نے جواب دیا کہ چونکہ مولانا ابوالکلام آزاد نے مجکو کلکتہ بھیجا ہے اور میں یہاں صرف ان کے حکم کی تعمیل میں آیا ہوں اس لئے جب تک مولانا خود بطیبِ خاطر اجازت نہیں دیں گے میں کلکتہ چھوڑنے کا خیال بھی نہیں کرسکتا۔ اس خط کے پندرہ بیس دن کے بعد مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کا جواب آیا کہ میں نے مولانا ابوالکلام سے گفتگو کرلی ہے وہ فرماتے ہیں کہ سعید کے کلکتہ بھیجنے سے میرا جو مقصد تھا وہ پورا ہوگیا ہے، یعنی کلکتہ مدرسہ تقسیم کے وقت بالکل ختم ہوگیا تھا اب پھر وہ دوبارہ قائم ہوگیا ہے اور اپنی گذشتہ شان وشوکت کے ساتھ چل رہا ہے، اس لیے سعید اب اگر کہیں اور جانا چاہے تو جاسکتا ہے مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ اب مدرسۂ عالیہ کلکتہ اس پوزیشن میں ہے کہ کوئی بھی اس کا پرنسپل ہوا سے سنبھال سکتا ہے۔ ظاہر ہے اس کے بعد مجھے کوئی عذر نہ ہونا چاہیے تھا، لیکن مجکو علی گڑھ کی سیاست اور وہاں کے حالات کا جو علم تھا اس کی بناپر میں نے بھائی مرحوم کو پھر لکھا کہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب ڈاکٹر عبدالعلیم کو عربی کا پروفیسر بنانے کی ٹھانے ہوئے ہیں اس لئے کوئی اور شخص اس جگہ پر آہی نہیں سکتا، بہتر یہ ہے کہ آپ خاموش رہیں اور میرا کسی سے تذکرہ بھی نہ کریں، لیکن وہ کہاں ماننے والے تھے۔ اس زمانہ میں وہ کورٹ کے بھی ممبر تھے اور اکزکٹو کونسل کے بھی، آخر انھوں نے ایک دن ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب سے میرے متعلق کہہ ہی دیا، ڈاکٹر صاحب کوئی کچی گولیاں کھیلے ہوئے تھوڑی تھے جو مولانا کی باتوں میں آجاتے، فوراً بولے: مولانا! اس میں شبہ نہیں کہ اکبرآبادی اس جگہ کے بہمہ وجوہ مستحق ہیں لیکن مدرسۂ عالیہ کلکتہ بھی تو علی گڑھ کی طرح ہمارا ایک وقیع اور نامور قومی وملی ادارہ ہے، ہمیں اس کا مفاد بھی پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے، یہاں عربی کی پروفیسرشپ کے لئے تو کچھ دوسرے لوگ بھی ہوسکتے ہیں لیکن کلکتہ کے مدرسۂ عالیہ کے لئے اکبرآبادی جیسا کوئی دوسرا پرنسپل نہیں مل سکتا،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس لئے قومی مفاد کے پیش نظر میری قطعی اور آخری رائے ہے کہ اکبر آبادی کو کلکتہ سے نہ ہٹایا جائے، مولانا ڈاکٹر صاحب کے تیور پہچان گئے اور چپ ہو گئے اور بات آئی گئی ہو گئی۔

عجیب بات ہے، ایک وقت تھا جب مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے علی گڑھ میں مجکو لانے کی تحریک کی اور ناکام رہے اور جب کرنل بشیر حسین زیدی وائس چانسلر ہوئے تو اب انھوں نے خود مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سے درخواست کی کہ وہ مجکو علی گڑھ آنے پر آمادہ کردیں، زیدی صاحب نے علی گڑھ آتے ہی یونیورسٹی میں اصلاحات کرنے اور اس کو ترقی دینے کا جو وسیع پروگرام بنایا تھا اس میں فیکلٹی آف تھیالوجی (جو اس وقت کس مپرسی کے عالم میں تھی) کو بھی آگے بڑھانے کا پروگرام شامل تھا، اس فیکلٹی کے ماتحت دو شعبے ہیں ایک شعبۂ سنّی دینیات اور دوسرا شعبۂ شیعہ دینیات، اول الذکر کی صدارت کے لئے زیدی صاحب نے میرا انتخاب کیا اور موخر الذکر کی صدارت کے لئے مولانا سید علی نقی النقوی کا جو اپنے علم وفضل اور علمی وجاہت کے باعث ایران اور عراق کے علماء میں بھی معروف ومشہور تھے، زیدی صاحب ایک عملی آدمی ہیں۔ جب وہ ایک کام کا ارادہ کرتے ہیں تو دیر نہیں کرتے اور لگ لپٹ کر اسے جلد سے جلد کر گذرتے ہیں۔ انھوں نے مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سے جب میرے متعلق بات چیت کی اور مولانا نے اس سلسلہ میں ان کی امداد کا وعدہ کر لیا تو انھوں نے مولانا سے کہا کہ خط وکتابت سے کام نہیں چلے گا۔ آپ خود کلکتہ جائیے اور پختہ وعدہ لے کر آئیے، چنانچہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کلکتہ آئے اور گفتگو کی، گفتگو میں مولانا نے یہ بھی کہا کہ سنی دینیات کی صدارت کے ساتھ اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی ڈائرکٹرشپ بھی تم کو دینے کا ارادہ ہے، اس کے متعلق میں نے صاف لفظوں میں کہا انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر عبدالعلیم ہیں اس لئے میں ہرگز اس کو پسند نہیں کروں گا کہ ان کا یہ عہدہ ان سے چھین کر مجکو دیا جائے البتہ ڈاکٹر عبدالعلیم خود اپنی خواہش سے کسی سبب سے مستعفی ہو جائیں تو مجکو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس کی ذمہ داری قبول کرنے میں عذر نہ ہوگا[1]، اس لئے اب مجکو جو کچھ غور کرنا ہے وہ صرف شعبۂ دینیات کے معاملہ پر غور کرنا ہے اور اس کا جواب میں کچھ دنوں کے بعد دوں گا۔

مولانا واپس چلے گئے۔ میں نے یہاں غور کیا تو سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ میں کلکتہ میں ایک سرکاری ادارہ کا پرنسپل تھا اور اس حیثیت سے میں وہاں فرسٹ کلاس گورنمنٹ گزیٹڈ آفیسر تھا اور میری تنخواہ اس وقت وہی تھی جو آج کل علی گڑھ میں پروفیسر کی ہوتی ہے، پھر ایک نہایت شاندار کوٹھی مفت بغیر کرایہ کے سرکار کی طرف سے ملی ہوئی تھی، اور اس کے مقابلہ میں علی گڑھ میں جو پوسٹ تھی وہ صرف ریڈر کی تھی، پروفیسر کی پوسٹ ابھی تک دینیات کے لئے منظور نہیں ہوئی تھی، لیکن اس کے باوجود محض علی گڑھ یونیورسٹی کی عموماً اور اس کے شعبۂ دینیات کی خصوصاً خدمت کے جذبہ سے میں نے علی گڑھ جانے کا ارادہ کر لیا اور بھائی حفظ الرحمٰن صاحب کو اس کی اطلاع دے دی، لیکن جب بنگال گورنمنٹ کو اس کا علم ہوا تو چیف منسٹر ڈاکٹر بی۔ سی رائے نے شخصی طور پر اس میں مداخلت کی اور مجکو بلا کر گفتگو کی، یہ گفتگو کئی روز تک چلتی رہی، اتفاق سے انھیں دنوں میں پروفیسر آل احمد سرور میرے ہاں مقیم تھے، جو کچھ ڈاکٹر بی۔ سی رائے سے گفتگو ہوتی تھی میں شام کو گھر آکر پروفیسر سرور صاحب

---

[1] میری اس قدر صاف اور صریح گفتگو کے بعد بھی سخت افسوس ہے کہ جب میں علی گڑھ پہونچا تو ایک حلقہ میں میری نسبت پروپگنڈا بھی کیا گیا کہ میں انسٹی ٹیوٹ کا ڈائرکٹر بننے کی خواہش میں آیا ہوں، حالانکہ زیدی صاحب اور ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب جو اس زمانہ میں پرو وائس چانسلر تھے یا میرے دوست احباب گواہی دے سکتے ہیں کہ میں نے کسی کے سامنے اس قسم کی خواہش کا کبھی بھولے سے بھی تذکرہ کیا ہو! اس کے لئے درخواست کرنا یا پروپگنڈہ کرنا تو بہت بڑی بات ہے، کیونکہ یہ دونوں چیزیں میری فطرت اور طبیعت سے بہت بعید ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے اسے نقل کر دیتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کا اصرار تھا کہ میں کلکتہ نہ چھوڑوں۔ میں کلکتہ چھوڑنے کا جو سبب بیان کرتا تھا ڈاکٹر صاحب فوراً اس کا توڑ کر دیتے تھے، آخر جب میرے سب حربے بیکار ہو گئے تو میں نے کہا: "میں زیدی صاحب سے وعدہ کر چکا ہوں اور اب وعدہ خلافی کرتے ہوئے شرم آتی ہے اس لئے آپ اگر زیدی صاحب کو خط لکھ کر مجھ کو ان سے مانگ لیں اور وہ اس پر رضامند ہو جائیں تو میری شرم رہ جائے گی اور میں کلکتہ نہیں چھوڑوں گا۔" ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا: "میں زیدی صاحب کو جانتا ضرور ہوں، لیکن معاملہ ایسا ہے کہ میں ان کو نہیں لکھ سکتا۔" بات اس پر ختم ہو گئی اور میں وہاں سے سبکدوش ہو کر ۵۹ء میں علی گڑھ چلا آیا۔[1]

یہاں علی گڑھ میں زیدی صاحب نے میرے ساتھ لطف و کرم اور تعظیم و تکریم کا جو خصوصی معاملہ کیا میں اسے کبھی فراموش نہیں کر سکتا اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے دل میں دینیات کی کتنی اہمیت اور اس کو ترقی دینے کا کیسا جذبہ اور ولولہ تھا، میرے سب دوست احباب اچھی طرح جانتے ہیں کہ لین دین کے معاملہ میں کبھی میری زبان کھلتی ہی نہیں ہے، چنانچہ یہاں بھی میں نے تنخواہ وغیرہ کے سلسلہ میں کچھ نہیں لکھا اور نہ اس پر گفتگو کی، لیکن زیدی صاحب نے ازخود میرے متعلق اکزکٹو کونسل سے تین باتیں ایسی منظور کرالیں جو غالباً پوری یونیورسٹی میں کسی کے لئے بھی نہیں ہوں گی۔ حالانکہ مولانا سید علی نقی النقوی صاحب شیعوں میں مجتہد اعظم

---

[1] ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کو میرے علی گڑھ جانے کی خبر ہوئی تو ازراہ شفقت و محبت پٹنہ سے مجھے خط لکھا اور اس میں مدرسۂ عالیہ کلکتہ کے متعلق اظہار تشویش کرنے کے بعد اپنی مسرت کا اظہار فرمایا اور اس کے بعد یہ شعر تحریر کیا:

اُگ رہا ہے در و دیوار پہ سبزہ غالبؔ
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا مرتبہ رکھتے ہیں اور زیدی صاحب (جو خود بھی شیعہ ہیں) مولانا کے معتقدوں میں سے ہیں، لیکن ان تین خصوصیات سے وہ بھی محروم تھے، اور وہ یہ ہیں:

(۱) مجکو ریڈر کی پوسٹ کی انتہائی تنخواہ دی گئی۔

(۲) میرے لئے آزمائشی ایک سال کی مدت (PROBATION) اڑادی گئی اور پہلے ہی دن میں مستقل ہو گیا۔

(۳) ایک بڑی وسیع اور کشادہ کوٹھی مجکو رہائش کے لئے مفت بغیر کرایہ کے دی گئی اور چونکہ میں سینیر تھا اس لئے صدر شعبۂ سنی دینیات ہونے کے علاوہ فیکلٹی کا ڈین بھی میں ہی مقرر کیا گیا اور اس طرح سنی دینیات کے علاوہ شیعہ دینیات کا شعبہ بھی میری نگرانی اور انتظام میں آگیا۔ زیدی صاحب کے زمانہ میں اس فیکلٹی نے کیا ترقی کی اس کا ذکر اپنی جگہ پر آئے گا۔

میں جب علی گڑھ پہونچا ہوں تو اس وقت یہاں اساتذہ میں دو گروہ تھے اور دونوں ایک دوسرے سے برسرپیکار۔ ایک گروہ اسلام پسند کہلاتا تھا اور دوسرا کمونسٹ یا ترقی پسند، پہلے گروہ میں دو قسم کے لوگ شامل تھے ایک وہ جو واقعی عملاً بھی مسلمان تھے اور دوسرے وہ جن کو عملاً اسلام سے تعلق محض برائے نام ہی تھا۔ عید بقرعید کے سوا مسجد میں ان کی صورت نظر نہیں آتی تھی، یہی حال دوسرے طبقہ کا تھا، اس میں چند لوگ تو وہ تھے جو واقعی کمونسٹ تھے اور غالباً اس پارٹی کے باقاعدہ ممبر بھی تھے، ان کے علاوہ چند ایسے افراد بھی اس گروہ میں شامل تھے جو کمونسٹ برائے بیت ہی تھے۔ ان دونوں گروہوں کی کشمکش کا اثر یونیورسٹی کے نظم ونسق پر اس طرح پڑتا تھا کہ کسی پوسٹ (خواہ تعلیمی ہو یا انتظامی) پر تقرر کا جب معاملہ پیش آتا تھا تو ہر فریق کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ اس کے ڈھب کا آدمی ہو۔ اس زمانہ میں بعض تقررات ایسے ہو گئے جن پر دونوں گروہوں میں سخت کشمکش اور کشیدگی برپا تھی اور یہ تقرر گویا اسلام اور کفر کی جنگ کا باعث ہو گئے تھے، میری افتاد طبع شروع سے یہ رہی ہے کہ کالج یا دفتر اور وہاں سے سیدھا گھر! دو ایک نہایت عزیز اور علمی مذاق کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دوست کبھی کبھار ان کے مکان پر چلا گیا تو چلا گیا ورنہ کبھی کسی کے مکان پر بغرض ملاقات نہیں جاتا۔ پارٹی بازی اور گروہ بندی سے ہمیشہ دور رہا ہوں اور اسی وجہ سے کسی مذہبی یا سیاسی جماعت کا کبھی ممبر تک نہیں ہوا۔ اس بنا پر مذکورہ بالا دو طبقوں میں سے میرا تعلق کسی ایک طبقہ سے بھی نہیں تھا۔ اکاڈمک کونسل وغیرہ میں جب کوئی معاملہ آتا تھا تو جو بات میرے نزدیک خدا لگتی اور ایمانداری کی ہوتی تھی وہ کہتا تھا۔ اسلام پسند طبقہ میں مشہور تھا کہ ترقی پسند طبقہ کو زیدی صاحب کی سرپرستی حاصل ہے، لیکن درحقیقت یہ ان پر بالکل غلط الزام تھا، وہ جو فیصلے کرتے تھے ایمانداری اور جرأت سے کرتے تھے، اس میں نہ گروہ بندی کا شائبہ ہوتا تھا اور نہ حکومت کے ساتھ تملق اور چاپلوسی کا، چنانچہ میرے سامنے کی بات ہے شعبۂ معاشیات میں لکچرر کی پوسٹ پر ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی کے تقرر کے سلسلہ میں سلکشن کمیٹی کی سفارشات اکزکٹو کونسل میں پیش ہوئیں تو ایک نہایت نامور اور مشہور غیر مسلم ممبر کونسل نے زیدی صاحب کو خطاب کر کے کہا: "جناب وائس چانسلر صاحب! ان صاحب کے متعلق آپ نے تحقیق بھی کر لی ہے، یہ جماعت اسلامی کے سرگرم کارکن اور عہدہ دار ہیں"۔ زیدی صاحب نے فوراً جواب دیا: "جی ہاں! میرے علم میں ہے کہ وہ جماعت اسلامی کے عہدہ دار ہیں، لیکن اپنے مضمون میں قابل بھی ایسے ہیں کہ سلکشن کمیٹی کے ممبر کی حیثیت سے پٹنہ یونیورسٹی کے جو پروفیسر معاشیات آئے تھے انھوں نے نجات اللہ صدیقی کے انتخاب پر مجھکو مبارکباد پیش کی تھی"۔ اس کے بعد زیدی صاحب ان صاحب کی طرف خاص طور پر متوجہ ہوئے اور بولے: مجھے معلوم ہے کہ گورنمنٹ جماعت اسلامی کو پسند نہیں کرتی ہے لیکن گورنمنٹ کا کوئی آرڈر یا سرکلر اس بارہ میں بالکل نہیں ہے کہ جماعت اسلامی کے ممبر کو ملازمت میں نہ لیا جائے اس بنا پر محض جماعت کا ممبر ہونے کے باعث ایک لائق اور قابل شخص کی خدمات سے فائدہ نہ اٹھانا یونیورسٹی کے ساتھ خیر خواہی نہیں بدخواہی ہے اور یہ بدخواہی میں برداشت نہیں کر سکتا۔ اس زمانہ میں اکزکٹو کونسل میں اسلام پسند طبقہ کے نمائندہ اور لیڈر جناب ایم۔ اے خواجہ تھے،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انھوں نے زیدی صاحب کا یہ جرأت مندانہ جواب سنا تو خوشی میں سامنے کی میز کو زور سے تھپ تھپ کر اس کی داد دی اور اس کے بالمقابل جو صاحب ترقی پسند طبقہ کے نمائندہ تھے، میں نے دیکھا کہ ان کا چہرہ اتر گیا تھا۔ یہ ایک واقعہ میں نے بر طور مثال لکھا ہے ورنہ مجھے اور بھی متعدد واقعات یاد ہیں جن میں زیدی صاحب نے اکاڈمک کونسل یا اکزکٹو کونسل میں ایسے ہی جرأت مندانہ اقدامات کئے ہیں جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مسلم یونیورسٹی کے مفاد کے مقابلہ میں کسی چیز کی پروا نہیں کرتے تھے۔

زیدی صاحب گھر کے رئیس اور نواب تھے اور ایک ریاست کے وزیراعظم رہ چکے تھے، اس بنا پر طبیعت میں فیاضی، سیرچشمی اور عالی ہمتی تھی۔ ان اوصاف وکمالات کے باعث وہ اساتذہ اور طلباء دونوں میں بڑی عزت اور قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ مجھے وہ وقت یاد ہے کہ ۱۹۶۲ء میں یونیورسٹی کے بعض طلباء میں مارپیٹ کے باعث جب شہر میں بہت سنگین ہندو مسلم فساد ہوا ہے اور ہندو نوجوانوں کے ایک بہت بڑے گروہ نے شمشاد مارکیٹ میں آکر لوٹ مار کی اور آگ لگائی تو ایس۔ ایس ہال کے تمام طلباء غصہ میں بپھرے ہوئے سب ایک جگہ جمع ہوگئے اور شمشاد مارکیٹ کی طرف بڑھنے لگے تو زیدی صاحب فوراً موقع پر پہونچ گئے اور بڑی ہمت کے ساتھ ان لڑکوں کا راستہ دونوں ہاتھ پھیلا کر روک کر کھڑے ہوگئے، میں اس وقت زیدی صاحب کے ساتھ ہی کھڑا ہوا تھا، زیدی صاحب نے ایس ایس ہال کے تمام دروازے مقفل کرا دیئے تھے، شمالی دروازہ پر طلباء کا ہجوم تھا، وہ انتقام انتقام اور اللہ اکبر کے نعرے لگا رہے تھے اور زیدی صاحب ان سب کو روکے ہوئے کہہ رہے تھے کہ میں آپ لوگوں کو ہرگز نہیں جانے دوں گا، آپ لوگ اطمینان رکھیں میں نے پولیس کی ایک بھاری جمعیت کو بلوا کر غنڈوں اور بدمعاشوں کو شمشاد مارکیٹ سے بھگوا دیا ہے اور اب وہاں امن وامان ہے، ابھی یہ سب کچھ ہو ہی رہا تھا کہ اتنے میں خبر آئی کہ غنڈوں نے زنانہ کالج میں لڑکیوں کے ہوسٹل پر حملہ کر دیا ہے، یہ سنتے ہی لڑکے آپے سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

باہر ہو گئے اور چیخ چیخ کر کہنے لگے: لعنت ہے ہمارے اوپر، اگر ہم اپنی بہنوں کی حفاظت نہ کریں اور غنڈوں سے انتقام نہ لیں۔ زیدی صاحب نے ہر چند کہا اور سمجھایا کہ یہ خبر غلط اور بے بنیاد ہے، مگر لڑکے ماننے والے کہاں تھے، آخر زیدی صاحب نے کہا کہ اچھا چلو! میں خود تمھارے ساتھ چلتا ہوں، اگر یہ خبر صحیح ہے تو میں تم کو اجازت دیدوں گا کہ غنڈوں کو ایسا سبق دو جو عمر بھر ان کو یاد رہے، چنانچہ زیدی صاحب آگے آگے اور سینکڑوں طلبا ان کے پیچھے، زنانہ کالج پہونچے تو معلوم ہوا کہ واقعی یہ خبر غلط اور بے بنیاد تھی، لڑکوں کو اب اطمینان ہو گیا اور زیدی صاحب نے ان سب کو پر امن طریقہ پر واپس لاکر انھیں ان کے ہوسٹلوں میں بند کر دیا، یہ تمام واقعات میری نظر سے گزرے ہیں اور میرے دل پر زیدی صاحب کی پھرتی ہستعدی، بیدار مغزی اور ہمت وجرأت کا بڑا اثر ہے، اڈمنسٹریشن ہو تو ایسا ہو، میرے خیال میں بدر الدین طیب جی کو مستثنیٰ کر کے کسی اور وائس چانسلر کی یہ ہمت نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ مشتعل طلبا ر کے اس سیلِ رواں کے سامنے دیوار بن کر ان کے سامنے کھڑا ہو جاتا اور حسنِ تدبیر سے اس طرح ان کو قابو میں لے آتا۔

زیدی صاحب کو یونیورسٹی کے اسلامی کردار کا بھی بڑا لحاظ اور پاس تھا، یونیورسٹی کے ہر فنکشن کا آغاز قرآن مجید کی تلاوت سے ہوتا تھا، مغرب کی نماز کے وقت میٹنگ ملتوی ہو جاتی تھی، رمضان کے شروع میں رجسٹرار آفس سے باقاعدہ ہدایت نکلتی تھی کہ اس ماہِ مقدس میں دن کے وقت مطبخ بند رہیں گے اور یونیورسٹی میں کہیں لنچ یا ٹی پارٹی نہیں ہوگی، خود بھی روزہ رکھتے تھے اور ایک روز اپنے ہاں بڑی شاندار افطار پارٹی کرتے تھے جس میں اساتذہ اور انتظامیہ کے حضرات کثرت سے مدعو ہوتے تھے، اسی قسم کی ایک پارٹی کا لطیفہ ہے کہ ایک بہت طویل میز پر انواع واقسام کے پھل اور مخصوص قسم کی افطاریاں چنی ہوئی تھیں اور سب حضرات میز کے دونوں طرف کھڑے افطار کے وقت کا انتظار کر رہے تھے، میں زیدی صاحب کے پاس کھڑا ہوا تھا اور مولانا سید علی نقی النقوی صاحب ہم دونوں کے سامنے میز کی دوسری جانب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کھڑے تھے، اتنے میں مسجد کا سائرن بجا اور میں نے افطار کے لئے ہاتھ بڑھایا تو زیدی صاحب نے بھی ہاتھ بڑھا دیا۔ مولانا اوبد اکے بولے: زیدی صاحب! ابھی ہمارا وقت نہیں ہوا ہے۔ زیدی صاحب نے فوراً جواب دیا: سنئے مولانا! میں نماز پڑھتا ہوں شیعہ مذہب پر، لیکن روزہ افطار کرتا ہوں سنی مذہب کے مطابق۔

زیدی صاحب کی بڑی تمنا تھی کہ یونیورسٹی کی جامع مسجد میں لاؤڈ اسپیکر کا انتظام ہو تا کہ جمعہ کی نماز کا خطبہ اور تلاوتِ قرآن ہر شخص تک پہونچے لیکن ناظم سنی دینیات مولانا محمد حفیظ اللہ صاحب مرحوم کے نزدیک یہ ناجائز تھا اس لئے وہ اس کے سخت مخالف تھے، جب میں علی گڑھ آیا تو زیدی صاحب نے مجھ سے بھی اس خواہش کا اظہار کیا، میں نے ان کی تائید کی اور دوسرے دن ناظم صاحب مرحوم کو دفتر میں بلا کر میں نے پوچھا کہ آپ لاؤڈ اسپیکر کو کیوں ناجائز سمجھتے ہیں؟ انھوں نے اس کے دلائل پیش کئے، میں نے ان کے جوابات دیے، مگر ان کی تشفی نہیں ہوئی، میں نے بہرحال مسجد میں لاؤڈ اسپیکر لگانے کا حکم دے دیا، زیدی صاحب کو اس کی اطلاع ہوئی تو بہت خوش ہوئے اور مجکو دعائیں دیں، زیدی صاحب کھلے دماغ سے ہر ایک معاملہ پر غور کرتے تھے اور اس طرح جب وہ ایک فیصلہ کر لیتے تھے، اب ان کو اس کی پروا نہیں ہوتی تھی کہ لوگ کیا کہیں گے۔ جب ان کی محبوب اور نہایت لائق بیوی قدسیہ بیگم کا انتقال ہوا تو لوگوں میں بڑا چرچا تھا کہ نماز جنازہ سنی مذہب کے مطابق ہوتی ہے یا شیعہ مذہب کے مطابق، لیکن جب جنازہ کوٹھی سے روانہ ہونے لگا تو زیدی صاحب نے یہ اعلان کر کے تمام چہ می گوئیاں ختم کر دیں کہ "میری درخواست پر مولانا سعید احمد اکبرآبادی نماز جنازہ پڑھائیں گے[۱]"

زیدی صاحب کے زمانہ میں اسلام پسند اور ترقی پسند گروپ یونیورسٹی کے آئینی ضوابط

---

[۱] واضح رہے کہ مرحومہ پروفیسر احمد شاہ بخاری کی بہن اور سنی المذہب تھیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے اندر رہ کر کس طرح باہم دگر بر سرِ پیکار رہتے اور زیدی صاحب حق و انصاف کی راہ اختیار کرتے تھے ؟ اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ شعبۂ فارسی کے لئے پروفیسر کا انتخاب ہونا تھا اور اس کے لئے ڈاکٹر نذیر احمد جو یہاں پہلے سے ریڈر چلے آرہے تھے امیدوار تھے۔ ڈاکٹر صاحب فارسی زبان و ادب کے نہایت بلند پایہ فاضل اور محقق ہیں اور ان کی تحقیقات و اکتشافاتِ علمی کی دھوم ایران کی علمی مجلسوں میں بھی ہے، لیکن ساتھ ہی موصوف شکل و صورت، وضع قطع اور عمل و کردار کے اعتبار سے بالکل مولانا بھی ہیں، اس بنا پر ڈاکٹر صاحب ترقی پسند گروپ کی آنکھوں میں کھٹکتے تھے اور وہ اس فکر میں تھا کہ سلکشن کمیٹی کے لئے بحیثیت اکسپرٹ کے ایسے حضرات کا انتخاب کرائے جن سے اس کا مدعا پورا ہو۔ میں ترقی پسند گروپ کی اس کوشش سے واقف تھا، اس لیے جب اکاڈمک کونسل میں فارسی کے پروفیسر کی پوسٹ کے لئے سلکشن کمیٹی بنانے کا آئیٹم پیش ہوا میں نے فوراً کھڑے ہو کر قاضی عبدالودود کا نام پیش کر دیا، جیسا کہ توقع تھی ترقی پسند گروپ کے سربراہ جو اس وقت غالباً ڈین آف دی فیکلٹی آف آرٹس بھی تھے، انھوں نے کھڑے ہو کر میری مخالفت کی اور کہا کہ قاضی صاحب اردو زبان و ادب کے بلند پایہ محقق ہیں۔ لیکن وہ فارسی کے آدمی نہیں ہیں، میں نے جواب میں کہا کہ قاضی صاحب اردو کی طرح فارسی زبان و ادب کے بھی بڑے فاضل نقاد اور بلند پایہ محقق ہیں اور استدلال میں فارسی زبان و ادب پر موصوف کے پانچ چھ بلند پایہ تحقیقاتی مقالات کا حوالہ دیا، ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب نے میری تائید کی اور یہ نام منظور ہو گیا۔ دوسرا نام ڈاکٹر ہادی حسن مرحوم کا پیش ہوا اور وہ بھی منظور ہو گیا۔ جب سلکشن کمیٹی کی میٹنگ ہوئی تو وہ ہی ہوا جس کی توقع تھی، یعنی ڈاکٹر ہادی حسن صاحب مرحوم نے ایک اور صاحب کے نام کی سفارش کی اور قاضی عبدالودود صاحب نے ڈاکٹر نذیر احمد کے حق میں رائے دی جب بحث زیادہ بڑھی تو قاضی صاحب کا رویہ زیادہ سخت ہو گیا اور انھوں نے بہ طور چیلنج کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ڈاکٹر ہادی حسن سے کہا کہ آپ کے پسندیدہ امیدوار کی جو تحقیقی کتاب ہے اور جس پر ان کو بڑا ناز ہے اسے ذرا منگوائیے، میں نے اس میں چالیس غلطیاں نوٹ کی ہیں، آپ مجھکو ان کا جواب دے دیجئے، اور اس کے بالمقابل ڈاکٹر نذیر احمد کے تحقیقاتی مضامین یہ ہیں، آپ ان میں کوئی غلطی ہو تو اس کی نشاندہی فرما دیجئے اس پر معاملہ ختم ہو گیا اور ڈاکٹر نذیر احمد پروفیسر نذیر احمد بن گئے، یہ سب کچھ زیدی صاحب کی صدارت میں ہوا۔ انھوں نے اکاڈمک کونسل یا سلکشن کمیٹی میں کوئی ایسی بات نہیں کہی اور نہ کوئی ایسا کام کیا جس کو دھاندلی یا عصبیت (MENTAL RESERVATION) کہا جائے، مجھے معلوم ہے کہ اسلام پسند گروپ کے لوگوں کے دل میں ان کے متعلق کیا کچھ نہیں کہا جاتا تھا، لیکن میرا ذاتی تجربہ اور مشاہدہ یہی ہے کہ وہ گروپ بندی اور جماعتی عصبیت سے بلند و بالا تھے، ان کی رائے سے اختلاف ہو سکتا ہے اور ان میں بعض کمزوریوں کی نشاندہی بھی کی جا سکتی ہے، لیکن وہ انڈی پنڈنٹ طریق فکر کے آدمی تھے نہ کسی پارٹی کے آلہ کار تھے اور نہ حکومت کے خوشامدی، انھوں نے مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے عہدہ کے وقار اور مرتبہ کا ہمیشہ لحاظ رکھا۔

زیدی صاحب کے زمانہ میں یونیورسٹی میں بڑی ترقی ہوئی، نئی شاندار عمارتیں تعمیر ہوئیں جن کی وجہ سے ان کو علی گڑھ کا شاہجہاں کہا جاتا تھا، میڈیکل کالج کی تعمیر اور اس کا آغاز انھیں کے عہد میں ہوا۔ وہ سفر کم کرتے تھے، دفتر میں پابندی سے بیٹھنا، فائلوں کو دیکھنا اور میٹنگس میں شریک ہونا ان کا روزمرہ کا معمول تھا۔ وہ علی الصباح ٹہلنے کے بڑی سختی سے پابند تھے، لیکن یہ وقت بھی یونیورسٹی کے کام سے فارغ نہیں ہوتا تھا۔ اسی اثنا میں یونیورسٹی میں جو عمارتیں زیر تعمیر ہوتی تھیں وہ ان کا معائنہ کرتے اور ضرورت ہوتی تو اس سلسلہ میں کوئی کارروائی کرتے تھے۔ سحر خیزی کی عادت ان کی طبیعت ثانیہ بن گئی تھی، بعض اوقات یونیورسٹی کے اہم معاملات پر غور و خوض وہ اسی وقت کرتے تھے اور رجسٹرار وغیرہ کو علی الصباح اپنی کوٹھی پر بلا کر ان امور پر گفتگو کرتے تھے، منہ اندھیرے میں بھی ٹہلنے اور ہوا خوری کا عادی ہوں،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میری اور ان کی مڈبھیڑ ہو جاتی تو بعض اوقات بڑی حسرت سے کہتے کہ "مولانا! دیکھیے کیا عجیب سہانا وقت ہے، اللہ کی رحمتیں برس رہی ہیں، لیکن بدقسمتی سے صرف ہم دو مسلمان ہیں جو اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں، باقی یہ سب ہندو ہیں جو آپ کو ہوا خوری کرتے نظر آ رہے ہیں۔

ایک عظیم کارنامہ

یہ سب کچھ تو ہے ہی لیکن دستوری اعتبار سے زیدی صاحب نے جو ایک اہم اور عظیم کارنامہ انجام دیا ہے وہ ہمیشہ یادگار رہے گا اور یونیورسٹی کی تاریخِ جدید کا کوئی مورخ اسے نظرانداز نہیں کر سکے گا، اس کی تفصیل یہ ہے کہ جیسا کہ ہوتا آیا ہے تقسیم کے بعد سے اس غریب یونیورسٹی کو کبھی چین نصیب نہیں ہوا، اس پر ہمیشہ اعتراضات اور خوردہ گیری کی بوچھار ہوتی رہی اور وقت کی چشمِ فسوں ساز کوئی نہ کوئی فتنہ جگاتی رہی ہے، غالب نے شاید اسی موقع کے لئے کہا تھا:

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

یونیورسٹی کی نسبت پبلک میں کچھ نہ کچھ چہ می گوئیاں ہوتی رہتی تھیں، زیدی صاحب کے زمانہ میں (غالباً ۵۸ء میں) ایک مرتبہ پارلیمنٹ میں یونیورسٹی پر بڑی لے دے ہوئی اور اس سلسلہ میں وزیر تعلیم ڈاکٹر شریمالی نے زیدی صاحب سے کچھ سوالات بھی کئے جن کے مناسب جوابات بھیج دیئے گئے۔ لیکن کہنے والوں کی زبانیں پھر بھی بند نہ ہوئیں تو آخر زیدی صاحب نے گورنمنٹ آف انڈیا کے ایما پر یونیورسٹی کی اکزکٹو کونسل کی طرف سے ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کرائی، اس کمیٹی کے صدر مشہور ماہر تعلیم پروفیسر جی، سی چٹرجی تھے اور سکریٹری مسٹر آر۔ پی۔ نائک آئی، سی، ایس جوائنٹ سکریٹری وزارت تعلیم تھے، بقیہ ارکان کمیٹی مندرجہ ذیل اصحاب تھے:

(۱) پروفیسر واڈیا۔ (۲) شری کرتار سنگھ ملہوترا۔ (۳) مسٹر پی، این، سپرو۔ (۴) مسٹر ایم۔ اے شاہ میری، باخبر اصحاب جانتے ہیں کہ یہ پوری کمیٹی ان حضرات پر مشتمل تھی جو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تعلیم کے نامور اور مشہور ماہر سمجھے جاتے ہیں اور اس بنا پر حق یہ ہے کہ اس سے بہتر کوئی اور کمیٹی نہیں ہو سکتی تھی، اب یہ بھی سن لیجئے کہ یونیورسٹی پر جو اعتراضات شد و مد سے کئے جاتے تھے ان کے بیت الغزل حسب ذیل تین اعتراضات تھے:

(۱) یونیورسٹی فرقہ پرستی کا گڑھ ہے۔ اس کے طلبار اور اساتذہ میں اکثریت ایسے ہی لوگوں کی ہے جن کے دماغ فرقہ پرستی کے زہر سے مسموم ہیں، اور اس بنا پر یونیورسٹی کے داخلوں میں، امتحانات میں اور تقرریات میں غیر مسلموں کے ساتھ امتیازی سلوک روا رکھا جاتا ہے۔

(۲) یونیورسٹی میں اقربا نوازی (NEPOTISM) عام ہے، چند خاندان ہیں جو یونیورسٹی پر چھائے ہوئے اور اس کے در و بست کے مالک ہیں۔

(۳) یونیورسٹی کا مالیاتی انتظام نہایت خراب اور فاسد (CORRUPT) ہے اور اس میں لاکھوں روپیہ کا ایر پھیر ہے۔

ظاہر ہے ایک مرکزی یونیورسٹی کی عزت و شہرت کو خاک میں ملانے کے لئے ان تین باتوں سے زیادہ کوئی اور بات مہلک اور خطرناک نہیں ہو سکتی، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان اعتراضات کی تحقیق و تفتیش کے سلسلہ میں زیدی صاحب نے رجسٹروں، فائلوں، حسابات کے رجسٹروں، دستاویزات اور حقائق و واقعات کی روشنی میں یونیورسٹی کی طرف سے جو جوابات فراہم کئے اور ان کے لئے جو مواد پیش کیا وہ ان کی بیدار مغزی، چستی اور لیاقت و قابلیت کا شاہکار ہے، کوئی امر خواہ کیسا ہی بے غل و غش ہو، لیکن اس کو اس طرح پیش کرنا کہ بڑے سے بڑا نکتہ چین بھی قائل ہو جائے اس کے لئے بھی تو حسن سلیقہ اور دل و دماغ کی اعلیٰ صلاحیت درکار ہے۔

© rasailojaraid.com